© rasailojaraid.com

غالبؔ کی زندگی کے تین اہم فیصلے

پرتو روہیلہ

غالبؔ کی زندگی پیدائش سے لے کر ان کی موت تک ہنگاموں سے لبریز رہی۔ قدم قدم پر وہ ایسے شدید حالات سے دو چار ہوئے جہاں انہیں سلیم الطبعی کے اظہار کے ساتھ قوتِ فیصلہ کے استعمال کی بھی شدید ضرورت ہوتی۔ سو اگر ان کی پُر آشوب زندگی کا احاطہ کیا جائے تو ایسے مواقع ہزاروں نہیں تو سیکڑوں ضرور ہوں گے جو ان کے لئے بہت اہم تھے۔ اب اگر ان سیکڑوں اہم واقعات سے اہم ترین منتخب کئے جائیں تو میری نظر میں وہ صرف تین بنتے ہیں اور وہ اس لئے نہیں کہ ان سے مقابل ہو کر غالبؔ نے انتہائی ہوشیاری اور سلیم الطبعی کا اظہار کیا بلکہ اس لئے کہ اس وقت کے حالات سے دو چار ہو کر غالبؔ نے جو فیصلے کئے وہ اتنے اہم، اثر انگیز اور دور رس تھے کہ انہوں نے نہ صرف غالبؔ کی زندگی کا رخ بدل دیا بلکہ اردو ادب کی تاریخ پر بھی نہ مٹنے والے نقوش مرتسم کر دیے۔ ان اہم ترین فیصلوں میں سب سے وقیع فیصلہ اسلوب بیدلؔ کو ترک کر کے آسان گوئی کا فیصلہ ہے۔ دوسرا فیصلہ وہ ہے جو انہوں نے کلکتے جاتے ہوئے لکھنؤ کے قیام کے دوران آغا میر سے ملاقات کے لئے اپنی چند شرائط پیش کر کے کیا اور تیسرا فیصلہ وہ ہے جو انہوں نے دہلی کالج کی مدرسی سے انکار کی صورت میں کیا۔ ظاہر ہے کہ ان تینوں فیصلوں میں پہلا فیصلہ تو خالصتاً ادبی ہے، یعنی جس کا تعلق غالبؔ کی ادبی شخصیت، اور ان کی ادبی اقدار سے ہے جب کہ باقی دونوں فیصلے غالبؔ کی معاش سے تعلق رکھتے ہیں اور اگر چہ فیصلوں کی اپنی بنیاد سماجی اور اخلاقی اقدار پر کیوں نہ ہو ان کے نتائج لازماً معاشی تھے۔ زیر نظر مضمون میں ان عوامل پر ہی بات ہوگی جو ان تینوں فیصلوں کا باعث ہوئے۔

عبدالصمد (ہرمزد) کا غالبؔ کی زندگی میں ورود ایک اتفاق بلکہ حسن اتفاق سہی لیکن دس گیارہ سال کی عمر میں ان کا شاعری کی طرف میلان اور پھر ظہوریؔ اور بیدلؔ جیسے فارسی شعراء کی طرف رغبت تو لازمی ان کے فطری رجحانات تھے جن سے خود ان کے لئے کوئی مفر نہیں تھا۔ اس لئے جب غالبؔ مبداء فیاض کی بات کرتے ہیں تو غلط نہیں کہتے۔ ورنہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ عبدالصمد کے زیر اثر انہوں نے آگرے ہی میں فارسی شاعری بھی شروع کر دی ہوتی۔ جب کہ فارسی شاعری پر انہوں نے تقریباً کلکتے کے سفر کے دوران زور دیا۔ سو کلکتے کے قیام کے دوران سراج الدین احمد کے ایما پر انہوں نے ''گلِ رعنا'' کا انتخاب کیا اور اردو کلام سے دو ثلث نکال ڈالے تو یہ اس دیوان سے تھا جو سفرِ کلکتہ سے پہلے مرتب ہو چکا تھا۔

گلِ رعنا کے دیباچۂ ریختہ میں غالبؔ بڑے شد و مد سے تحریر فرماتے ہیں۔ ''نگارندۂ ایں نامہ را آں در سر است کہ پس از انتخاب دیوانِ ریختہ بگرد آوردن سرمایۂ دیوانِ فارسی برخیزد۔ باستفادۂ کمال ایں فریو فن پسِ زانوئے خویشتن نشیند۔ امید کہ سخن سرایاں سخنور ستائی پراگندہ ابیاتی را کہ خارج ازیں اوراق یابند، از آثارِ ترادشِ رگِ کلکِ ایں نامہ سیاہ نشناسند و جامہ گرد آورد را

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درستایش ونکوہش آں اشعار ممنون و ماخوذ نسگالند۔ یارب ایں بوئے ہستی ناشنیدہ ازنیستی بہ پیدائی نارسیدہ یعنی نقش بضمیر آمدہٗ نقاش کہ بہ اسداللہ خان موسوم و بہ مرزا نوشہ معروف و بر غالبؔ متخلص است چنانچہ اکبرآبادی مولد و دہلوی مسکن است فرجام کا رنجفی مدفن نیز باد‘‘۔(کلیاتِ نثرِ غالبؔ ،ص ۶۰، ۱۲۸۷ مطبع نولکشور)

یہاں غالبؔ یہ نہیں بتاتے کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ یعنی اپنا دو تہائی اردو کلام نظر کر دینے کا سبب کیا ہے۔ البتہ وہ دیباچہ ’’گلِ رعنا‘‘ میں اتنا ضرور فرماتے ہیں ’’میں نے اردو گوئی میں بھی وہی طریقہ روا رکھا ہے جو فارسی میں روا رکھا تھا۔ میری شاعری کے دو دروازے ہیں۔ ایک اردو اور ایک فارسی‘‘۔(آثار غالبؔ۔ محمد اکرام۔ص ۵۷)۔ دیباچے میں اصل الفاظ اس طرح ہیں ’’چوں درآغاز خار خار جگر کاوی ءشوقم ہمہ صرفِ نگارش اشعار اردو زبان بودٗ در مسلک ایں تحریر نیز ہماں جادہ گزاردہ وہماں راہ سپردہ شد۔ ہر آئینہ ایں چمنستاں را دو در بروی ہم کشودم۔ نخستیں در را با شعار ہندی بگو ہر آمودم و دو میں در چوں آغوشِ شوق بروی ءپارسیاں واست و بام ایں صحیفہ بزبان اداشناساں گلِ رعنا۔ الہٰی ایں گلِ رعنا را بگوشۂ دستار قبول جادہی وہر کہ ایں را گرامی می نہد سپاسی از وے برمن نہی‘ اللہ بس باقی ہوس‘‘۔(کلیاتِ نثر غالبؔ ،ص ۵۹، ۱۲۸۷ مطبع نولکشور)۔ اب چونکہ پیراگراف ماقبل میں ہے کہ ’’نگارندۂ ایں نامہ را آن۔۔ بگرد آوردن سرمایۂ فارسی برخیزدٗ‘‘ اور یہاں وہ خود لکھتے ہیں کہ ’’جگر کاوی ءشوقم ہمہ صرفِ نگارش اشعار اردو زبان بودٗ‘‘ اس لئے ’’مسلک ایں تحریر‘‘ سے یہاں مطلب فارسی ہوا اور ’’ہماں جادہ گزاردہ وہماں راہ سپردہ شد‘‘ سے مطلب یہ ہوا کہ فارسی میں بھی میں نے یعنی وہی راہ اختیار کی ہے جو اردو میں اختیار کی تھی۔ جبکہ محترم محمد اکرام صاحب نے اس کے برخلاف لکھا ہے یعنی اردو میں وہ راہ اختیار کی ہے جو فارسی میں اختیار کی تھی۔ بہرصورت فی الوقت مسئلہ زیر بحث صرف یہ ہے کہ خود پسند، مغلوب الانا انفرادیت گزیدہ غالبؔ نے کن حالات کے تحت اپنے اسلوبِ شاعری میں تبدیلی کا فیصلہ کیا اور وہ کیا عوامل تھے جو اس فیصلے کے ذمہ دار ہوئے۔

ہمعصر شاہدوں میں حالیؔ سے بڑھ کر مستند و موقر گواہ کون ہوسکتا ہے۔ سو وہ اس ضمن میں یادگار غالبؔ میں کہتے ہیں ’’مرزا کے حق میں جو پیش گوئی میر تقی میرؔ نے کی تھی اس کی دونوں شقیں ان کے حق میں پوری ہوئیں ۔ ظاہر ہے مرزا اول اول ایسے رستے پر چل پڑے تھے کہ اگر استقامتِ طبع اور سلامتِ ذہن اور بعض صحیح المذاق دوستوں کی روک ٹوک اور نکتہ چیں ہمعصروں کی خردہ گیری اور طعن وتعریض سدِ راہ نہ ہوتی تو وہ شدہ شدہ منزل مقصود سے بہت دور جا پڑتے۔ سنا گیا ہے کہ اہل دہلی شاعروں میں جہاں مرزا بھی ہوتے تھے تعریضاً ایسی غزلیں لکھ کر لاتے تھے جو الفاظ اور ترکیبوں کے لحاظ سے تو بہت پُر شوکت وشاندار معلوم ہوتی تھیں مگر معنی ندارد گویا مرزا پر ظاہر کرتے تھے کہ آپ کا کلام ایسا ہوتا ہے‘‘۔ص ۱۱۱ یادگار غالب۔ گویا حالیؔ نے اس ضمن میں تین بڑے عوامل کی نشاندہی کی ہے۔ اول استقامت طبع وسلامت ذہن دوم صحیح المذاق دوستوں کی روک ٹوک، سوم نکتہ چیں ہم عصروں کی خردہ گری وطعن وتعریض۔ اکثر سوانح نگاروں نے ان تینوں عوامل کا ذکر کیا ہے۔ صحیح المذاق دوستوں کی روک ٹوک کے ضمن میں حالیؔ کہتے ہیں۔ ’’جب مولوی فضل حق سے مرزا کی راہ ورسم بہت بڑھ گئی اور مرزا ان کو اپنا خاص مخلص دوست اور خیر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خواہ سمجھنے لگے تو انہوں نے اس قسم کے اشعار پر روک ٹوک کرنی شروع کی۔ یہاں تک کہ انہیں کی تحریک سے انہوں نے اپنے اردو کلام میں سے جو اس وقت موجود تھا دو ثلث کے قریب نکال ڈالا اور اس کے بعد اس روش پر چلنا بالکل چھوڑ دیا''۔ بظاہر حالیؔ کی نظر میں ان صحیح المذاق لوگوں میں صرف یا خصوصاً مولوی فضل حق ہی تھے جن کی ایما پر غالبؔ نے اپنی پرانی روش ترک کی۔ ذکر غالبؔ میں مالک رام صاحب نے بھی مولوی فضل حق ہی کا ذکر کیا ہے۔''اردو میں وہ اپنی بیدلانہ طرز مولوی فضل حق کی روک ٹوک پر کلکتہ جانے سے پہلے ہی ترک کر چکے تھے۔'' (ص۔۱۶۰) لیکن دوسرے سوانح نگار مولوی فضل حق کے ساتھ آزردہؔ اور شیفتہؔ کو بھی شامل کرتے ہیں۔ شامل ہی نہیں کرتے بلکہ برابر کا شریک تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ نتالیا پری گارنا اپنی مشہور تصنیف غالبؔ میں تحریر کرتی ہیں۔''بہت سوں کا خیال ہے کہ اگر فضل حق نہ ہوتے تو غالبؔ کے حق میں میرؔ کی یہ پیش گوئی کہ کامل استاد نہ ملنے کی صورت میں یہ لڑکا مہمل بکنے لگے گا، سچی بات ثابت ہوئی۔ غالبؔ کے اسلوب کے تعلق سے ایسی سخت گیری کا مظاہرہ کرنے میں فضل حق اکیلے نہیں تھے۔ آزردہؔ جیسے سخن سنج اور سادگی کے شیدا نے بھی غالبؔ کو اظہار خیال کے دوسرے وسائل کی تلاش کی ترغیب دی۔ ان کے اثر سے نہ صرف اسلوب شاعری میں بلکہ شاعر کے مزاج میں بھی سلامت روی پیدا ہوئی۔ ظ۔ انصاری تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ زرتشی عبد الصمد کو نہیں بلکہ فضل حق، آزردہؔ اور شیفتہؔ کو غالبؔ کا استاد سمجھنا چاہیے۔ (ص۔۱۴۵،۱۴۷)

طعن و تعریض اور ہمعصروں کی خردہ گیری کے ضمن میں ایک لطیفہ بہت دہرایا گیا ہے جس کا حالیؔ نے مولوی عبد القادر رامپوری کی جبکہ پون ورمانے (غالب، شخصیت اور عہد) آغا جان عیشؔ کی زبانی بتایا ہے۔ حالیؔ کی زبانی یہ لطیفہ اس طرح ہے''ایک دفعہ مولوی عبد القادر رامپوری نے جو نہایت ظریف الطبع تھے اور جن کو قلعہ دہلی سے تعلق رہا تھا، مرزا سے کسی موقع پر کہا کہ آپ کا ایک اردو شعر سمجھ میں نہیں آتا اور اسی وقت دو مصرعے موزوں کر کے مرزا کے سامنے پڑھے۔

پہلے تو روغنِ گُل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے گُل بھینس کے انڈے سے نکال

مرزا سن کر سخت حیران ہوئے اور کہا حاشا یہ میرا شعر نہیں۔ مولوی عبد القادر نے از راہ مزاح کہا میں نے خود آپ کے دیوان میں دیکھا ہے اور دیوان ہو تو میں ابھی دکھا سکتا ہوں۔ آخر مرزا کو معلوم ہوا کہ مجھ پر اس پیرائے میں اعتراض کرتے ہیں اور گویا یہ جتاتے ہیں کہ تمہارے دیوان میں اس قسم کے اشعار ہوتے ہیں''۔ (ص۔۱۱۲)

ظاہر ہے غالبؔ کے کلام میں وہ سارے اشعار جو انہوں نے اخفائے حال، ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ نہ ہونے یا گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل کی ضمن میں کہے ہیں وہ در حقیقت اس ہم عصری خردہ گیری اور طنز و تعریض کے جواب میں دفاعاً ہی کہی گئے ہیں اور اس کی شدت کی تصدیق کرتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہ ستائش کی تمنا ہے نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی
گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے
مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
ہوتے ہیں ملول اس کو سن کے جاہل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

رہی بات استقامت طبع اور سلامت ذہن کی تو اس کا چونکہ غالبؔ کی شخصیت سے براہ راست تعلق ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان عوامل پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے جنھوں نے غالبؔ کی شخصیت کی تعمیر میں مدد کی۔

مرزا غالبؔ کی پیدائش ۸ رجب ۱۲۱۲ء مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء آگرے میں ہوئی۔ ان کا پورا نام اسد اللہ بیگ خان تھا۔ ان کے والد کا عرف میرزا دولھا تھا۔ ان کا میرزا نوشہ ہوا۔ ان کے دادا قوقان بیگ خان سمرقند سے جب ہندوستان آئے تو پہلے لاہور میں نواب معین الملک (میر منّو) کے ہاں ملازم ہوئے۔ میر منّو کی وفات پر وہ دلّی پہنچے اور نواب ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خان کی سرکار سے وابستہ ہوئے اور ان کے توسل سے شاہ عالم کی سرکار میں پچاس گھوڑے، نقارے اور نشان پر ملازم ہوئے اور وہاں سے مغلیہ سلطنت کی ملازمت ترک کر کے مہاراجہ جے پور کے دربار سے وابستہ ہوئے اور دلّی سے آگرہ چلے گئے۔

مرزا غالبؔ کے والد عبداللہ بیگ خان کی ولادت دلّی میں ہوئی۔ قوقان بیگ کی موت کے بعد عبداللہ بیگ خان لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کے ملازم رہے۔ وہاں سے حیدرآباد میں نواب نظام علی خان کی ملازمت اختیار کی اور وہاں کی خانہ جنگی سے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ وہاں راجہ راؤ بختاور سنگھ سے وابستہ رہے اور وہیں زمینداوں کی ایک مقامی لڑائی میں مارے گئے۔ عبداللہ بیگ خان کی شادی میرزا غلام حسین خان کمیدان کی لڑکی عزت النسا بیگم سے ہوئی۔ خواجہ غلام حسین خان کمیدان سرکار میرٹھ کے ایک فوجی آفیسر اور آگرے کے عمائدین میں سے تھے۔ مرزا عبداللہ بیگ خان اپنی سسرال میں مرزا دولھا کے نام سے مشہور تھے اور خانہ داماد تھے۔ ان کا اپنا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ان کی وفات پر راجہ بختاور سنگھ رئیس الور نے ''دو گاؤں سیر حاصل اور کچھ روزینہ'' میرزا مرحوم کے لڑکوں کی پرورش کے لئے مقرر کر دیا جو ایک مدت تک جاری رہا۔ لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کب اور کیوں بند کر دیا گیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مرزا عبداللہ بیگ خان کی وفات کے بعد ان کے بچوں کی سرپرستی اور دیکھ بھال ان کے چچا نصراللہ بیگ خان نے کی۔ نصراللہ بیگ خان کی شادی فخرالدولہ دلاورالملک احمد بخش خان والیٔ لوہارو کی بہن سے ہوئی۔ لیکن ان کے کوئی اولاد نہیں تھی اور پھر جلد ہی ان کا انتقال بھی ہوگیا۔ چنانچہ غالب اور انکے بہن بھائیوں کا سہارا صرف نصراللہ خان ہی رہ گئے۔ نصراللہ بیگ خان خود انگریزوں کی عملداری سے پہلے مرہٹوں کی طرف سے فرانسیسی جنرل Perron کی ماتحتی میں اکبرآباد کے حاکم تھے۔ ۱۸۰۳ء میں جب لارڈ لیک Lord Lake نے اس علاقے پر چڑھائی کی تو مرزا نصراللہ بیگ خان نے اغلباً نواب احمد بخش خان کی ایما پر بغیر دفاع کے ہتھیار ڈال دئے اور شہر لارڈ لیک کے حوالے کر دیا جس خدمت کے عوض ان کو انگریزی سرکار میں چار سو سوار کا رسالدار بنا دیا گیا اور سترہ سو روپیہ مشاہرہ مقرر ہوا اور اس کے بعد مرزا نصراللہ خان نے خود سونک اور سونسا لاکھ سوا لاکھ آمدنی کے دو زرخیز پرگنے جو بھرت پور کے نواح میں تھے ریاست ہلکر کے سپاہیوں سے چھین لئے۔ جنرل لیک نے سابقہ خدمات کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ دونوں پرگنے بھی ان کو تاحین حیات ان کی جاگیر میں دے دیے۔ نصراللہ خان اچانک ہاتھی سے گر کر ۱۸۰۶ء میں وفات پا گئے۔ اس وقت مرزا کی عمر آٹھ برس اور چند ماہ تھی۔

نصراللہ بیگ خان کی وفات پر ان کی تاحین حیات جاگیر سونک اور سانسا انگریزوں نے واپس لے لی اور رسالہ بھی توڑ دیا۔ البتہ یہ طے پایا کہ نواب احمد بخش خان پچاس سواروں کا ایک دستہ برقرار رکھیں گے۔ اس دستے کے اخراجات اور نصراللہ خان کے پسماندگان کی پنشن کے لئے یہ حکم صادر ہوا کہ نواب احمد بخش خان اپنی جاگیر کے لئے جو پچیس ہزار روپیہ سالانہ دیتے ہیں وہ اس شرط پر معاف کئے جاتے ہیں کہ آئندہ اس کے پندرہ ہزار وہ اس دستے کی غور و پرداخت پر خرچ کریں گے اور باقی دس ہزار مرزا مرحوم کے خاندان کو بطور پنشن ادا کریں گے۔ لیکن نہ جانے کیسے اس فیصلے کے ایک ماہ بعد ۷ جون ۱۸۰۶ء کو احمد بخش خان نے لارڈ لیک سے ایک خط حاصل کر لیا جس میں درج تھا کہ مرزا نصراللہ بیگ خان کے متعلقین کو پانچ ہزار روپیہ سالانہ حسب ذیل تفصیل سے ادا کیا جائے گا۔

۱۔ خواجہ حاجی دو ہزار روپیہ سالانہ ۲۔ مرزا نصراللہ بیگ کی والدہ اور تین بہنیں۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ ۳۔ مرزا نوشہ اور میرزا یوسف برادرزادگان مرزا نصراللہ خان مرحوم ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ۔ گویا پہلے دس ہزار کے پانچ ہزار ہوئے اور اب ان پانچ ہزار میں بھی خواجہ حاجی کو مرزا نصراللہ خان کے یا عبداللہ خان کے پس ماندگان میں شامل کر کے دو ہزار روپے سالانہ کا حقدار بنا دیا گیا۔ خواجہ حاجی کی اس پنشن میں شمولیت ہی اُس مقدمے کی بنیاد تھی جس کے لئے غالبؔ کلکتہ گئے اور ناکام ہونے پر ملکہ وکٹوریہ کے دربار میں بھی عریضہ گزار ہوئے لیکن کامیابی میسر نہ ہوئی۔

یہ چند حقائق کا ایک مختصر سا خاکہ ہے جو اکثر ''ذکر غالب'' مصنفہ مالک رام سے لئے گئے ہیں اور غالبؔ کے خاندانی ماحول اور ان کی تربیت و ذہنی نشو و نما کا پس منظر پیش کرتے ہیں۔ ان حقائق سے جو امور ابھر کر سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ خاندان اُن طالع آزما فوجی خدمت گاروں کا تھا جو توکّل بخدا ہندوستان کی وسعتوں میں اپنی ذہنی و جسمانی صلاحیتیں لے کر پہنچا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھا اور زندگی کے تقاضوں کے تحت جہاں کہیں بھی دو چار آسودگی کے لمحات کا امکان نظر آتا اپنی کمر کھول دیتا تھا۔ چونکہ اولاً ان کے اپنے آگے پیچھے اقامتی زندگی کی پابندیاں اور قبائلی واجتماعی رشتوں کی قیود و تقاضے نہیں تھے اس لئے وہ ان ساری اقدار سے وقتی طور پر آزاد تھے جو اخلاقیات کے ضمن میں آتی ہیں۔ چنانچہ وفاداری، دیانت، ایفائے عہد راستی، حق شناسی جیسی ساری اقدار نہ اس ماحول میں موجود تھیں اور نہ ہی ان لوگوں کا اسلوبِ حیات ان اقدار کے تعیش کا متحمل ہو سکتا تھا۔ اس ماحول کے سبب سے اہم ترین متحرک اور کارآمد قدر ہوشیاری، موقع شناسی اور حیات پرستی تھی۔ ہر وہ عمل کہ رشتۂ حیات برقرار رکھے جائز تھا اور ہر وہ حرکت جو پانی سے سر باہر رکھنے میں ممد ہو مباح تھی۔

لیکن یہ تو خاندان کی اور ماحول کی اجتماعی صورت حال تھی۔ انفرادی طور پر دیکھا جائے تو غالب کے دادا کا بھی کوئی ٹھور ٹھکانہ نہ تھا۔ ان کے حالات میں شاید ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن جب ان کے والد بھی بہ حیثیت خانہ داماد ہی مرے، تو یہ صورت حال قدرے غیر معمولی تھی۔ غالب ننھیال ہی میں رہے جو اس وقت خاصی متمول شمار کی جاتی تھی۔ ماحول خالص جاگیردارانہ تھا۔ روک ٹوک کے لئے نہ باپ، نہ چچا نہ بڑا بھائی۔ ننھیال کے قریبی عزیزوں میں ماموں کا ہی سراغ نہیں ملتا ہے تو نانا تو پھر دور کی بات ہے۔ ابھرتی ہوئی جوانی صورت شکل قد و قامت، اس پر مستزاد تموّل کے پس منظر اور شاعری کی افتادِ طبع نے اور بھی گل کھلائے۔ غرض

ہموارہ ذوقِ مستی و لہو و سرور و سور
پیوستہ شعر و شاہد و شمع و مے و قمار

غالب نے بھی اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ لیکن ان کے یہ اللّے تللّے زیادہ عرصے نہیں چلے تھے کہ زمینی حقائق نے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔ ان زمینی حقائق میں ایک تلخ حقیقت تو ان کے والد کی خانہ دامادی سے پیدا ہونے والی صورت حال تھی جس نے ان کی خوشی میں زہر گھول دیا تھا اور ان کو اس عزت و وقار سے محروم رکھا تھا جو عام حالات میں کسی شخص کو اپنے باپ کے گھر میسر ہوتا ہے۔ دوسری ان کی معیشت کی غیر مطمئن صورتحال تھی جس نے ان کی نفسیات پر اثر ڈالا۔ صاحب آثار غالب نے اس جگہ ایک بڑا معقول سوال اٹھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں ''یہ ایک معمہ ہے کہ اگر مرزا کی ننھیال اس قدر خوشحال تھی اور وہاں انہیں ہر طرح کا عیش و آرام میسر تھا تو انہیں آگرہ چھوڑنے اور نواب احمد بخش یا کسی پھوپھی کا دست نگر ہو کر دہلی جانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز امر یہ ہے کہ اگرچہ جب مرزا شروع شروع میں دہلی گئے ہیں تو ماں انہیں آگرے سے کبھی کبھار کچھ بھیج دیا کرتی تھیں۔ لیکن اس کے بعد مرزا پر سخت سے سخت مصیبتیں آئیں، ان کا بھائی دیوانہ ہو گیا، قرض خواہوں نے ان کی زندگی اجیرن کر دی، قمار بازی کی وجہ سے انہیں جیل جانا پڑا۔ غرضیکہ ان پر مصیبتوں اور رنج والم کے پہاڑ ٹوٹے لیکن ان کے خطوں میں اس امر کا کوئی نشان نہیں کہ ان کی ننھیال میں سے کسی نے آ کے ان کی خبر بھی پوچھی ہو۔۔۔ کیا اس تمام صورت حال سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بے جا ہوگا کہ مرزا کے لئے ننھیال میں فقط خوشی اور بے فکری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہ تھی، کلفتیں اور باطنی کشمکش بھی تھی۔'' (ص ۳۹)

غرض ان حقائق کو نظر میں رکھا جائے تو مرزا کی نشو و نما اور حالات زندگی میں احساس کمتری کے نفسیاتی اصول کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ وہ ایک شاندار ماحول میں پیدا ہوئے اور پلے لیکن اس ماحول کے مقابلے میں انہیں اپنی کمزوری اور کوتاہیوں کا احساس تھا۔ خدا نے ہمت بلند دی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ ان کوتاہیوں کی تلافی کی جائے۔ انہوں نے مادی ترقیوں کیلئے فضا ناساز گار سمجھ کر ادھر سے آنکھیں بند کیں۔ بزرگوں نے جو میراث چھوڑی تھی اس پر قناعت کی اور اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لئے شعر و سخن کا راستہ چنا تا کہ اس میں اتنی شہرت اور ناموری حاصل ہو جائے کہ اپنے ہم چشموں میں سے کسی سے کمتر نہ رہیں۔ چنانچہ خود اپنے ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں۔

''آہ از من کہ مرا زیاں زدہ و سوختہ خرمن آفریدند۔ بآئین نیاگانِ خویش سلطان سنجر دارائے کلاہ و کمرے و نہ بفرہنگ فرزانگاں، بو علی آسا علم و ہنرے۔ گفتم درویش باشم و آزادانہ راہ سپرم۔ ذوق سخن کہ از لی آوردہ بودم رہزنی کرد و مراں بداں فریفت کہ آئینہ زدودن و صورتِ معنی نمودن نیز کارِ نمایاں است۔ سرلشکری و دانشوری خود نیست۔ صوفی گری بگزار بہ سخن گری روی آر۔ ناگزیر ہم چناں کردم و سفینہ در بحر شعر۔۔۔ رواں کردم۔ قلم علم شد و تیر ہائے شکستہ آبا قلم''۔ (ص ۴۱) اپنے اس خیال کو کہ تیر ہائے شکستہ آبا قلم بن گئے انہوں نے ایک رباعی میں بھی نظم کیا ہے۔ رباعی

غالبؔ بہ گہر ز دودۂ زادشم
زاں رو بصفائے دمِ تیغ است دم
چوں رفت سپہبدی زدم چنگ بہ شعر
شد تیرِ شکستۂ نیاگاں قلم

غالبؔ نے شعر و سخن کے راستے کا انتخاب محض دوستوں کی ترغیب یا احباب کی تشویق پر نہیں کر لیا۔ بلکہ انہوں نے اپنی فطری صلاحیتوں کا اور اس وقت کی دہلی کے ماحول کا اچھی طرح جائزہ لے کر یہ فیصلہ کیا۔ یوں تو غالبؔ شادی سے پہلے بھی دہلی آیا جایا کرتے تھے لیکن جب شادی کے بعد دہلی آئے تو یہ وہ وقت تھا جب مرہٹوں کا زور ٹوٹ چکا تھا اور انگریزی نظم و نسق قائم ہو چکا تھا جس کے نتیجے میں دہلی اور دہلی کے اطراف امن و امان تھا اور ایک بار پھر یہاں کی مجلسی زندگی عود کر آئی تھی جس کے سبب علمی و ادبی سرگرمیوں کی گہما گہمی تھی۔ شہر کی آبادی میں اضافہ ہو گیا تھا اور علم و فن کا بکھرا ہوا شیرازہ دوبارہ بندھ ہو گیا تھا۔ بقول حالیؔ کے ''دارالخلافہ دہلی میں چند ایسے باکمال جمع ہو گئے تھے جن کی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری و شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کی یاد دلاتے تھے''۔ صاحب آثارِ غالبؔ نے اس دور کو انگلستان و مغرب کی دو مشہور و معروف تحریکوں Reformation اور Renaissance کے مماثل و متوازی قرار دیا ہے۔ انگلستان میں چھاپہ خانہ کی ابتدا سولہویں صدی میں ہوئی اور اس ہی کے باعث علم عام ہوا۔ دہلی میں بھی چھاپہ کا آغاز قریب قریب اسی دور میں ہوا اور اس نے اشاعت علم میں اہم کردار ادا کیا۔ نشاۃ ثانیہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا اہم واقعہ انجیل کا انگریزی میں ترجمہ ہے۔ ہندوستان میں بھی یہ کام شاہ ولی اللہ نے قرآن پاک کا پہلی بار فارسی میں ترجمہ کر کے کیا۔ Renaissance میں جس طرح عام ملکی زبانوں کی مقبولیت کو ترقی ملی بالکل اسی طرح ہندوستان میں یہ کام فارسی اور عربی کے مقابلے میں اردو نے کیا۔ دہلی کے علما وفضلا نے اردو کی ہمہ گیری کو محسوس کر کے اپنی توجہ اردو کی جانب مبذول کر دی اور اِس ضمن میں شہرہ آفاق اقدام شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین نے قرآن کا اردو میں ترجمہ کر کے کیا۔

یوں تو قرآن پاک کے فارسی اور اردو تراجم بھی اشاعت علم ہی کے اقدامات تھے لیکن عمومی تعلیم کی اشاعت اور عمومی درس و تدریس کی ترقی میں جو بے مثال بیدار مغزی اور صحیح قوت فیصلہ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے دکھائی اس کی مثال مشکل ہے۔ چنانچہ جب دہلی میں انگریزی سرکار نے دہلی کالج قائم کیا اور وہاں دہلی کے اکثر علما اور اکثر مسلمان امرا کو وہاں اپنی اولاد کی تدریس میں تامل ہوا تو شاہ صاحب نے بڑی شد و مد سے وہاں تعلیم کے تحصیل کی حمایت کر کے مسلمانوں اور خصوصاً اونچے طبقے کے امرا کی ذہنی خلش کو دور کیا جس کے نتیجے میں اس فیض کے دریا نے آہستہ آہستہ بہنا اور تشنہ اطراف کو سیراب کرنا شروع کر دیا۔ دہلی کالج کا قیام علی گڑھ کالج سے پچاس سال پہلے عمل میں آیا۔ چونکہ سر سید خود یہاں زیر تعلیم رہے تو میرے خیال میں تو علی گڑھ کا سارا بلیو پرنٹ انہوں نے دہلی کالج ہی سے تیار کیا۔ دہلی کالج کے معیار تعلیم اور وہاں کے اساتذہ کے معیارِ علم کا اندازہ سرسید، ذکاء اللہ، حالی، نذیر احمد وغیرہم جیسے کاملانِ فن سے لگایا جاسکتا ہے جنہوں نے اس درسگاہ سے تحصیل علم کی۔

اس دور کی علمی سرگرمیوں کا منظر نامہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل کی تحریک اصلاح دین کا ذکر نہ کیا جائے۔ اس تحریک کو وہابی تحریک بھی کہا جاتا ہے اور سرسید نے اس کو مارٹن لیوتھر کی Reformation سے مماثل قرار دیا ہے یہ وہ تحریک تھی کہ جس میں اس دور کا ہر صاحب علم وفکر مسلمان اس کے حق میں یا اس کے خلاف شریک تھا۔ اور باوجود اس کے کہ عمومی طور پر شعرا کو دین اور دینی مسائل کی باریکیوں سے لاتعلق ہی گردانا جاتا ہے، اس دور کے تمام اکابرین شعرا بھی کسی نہ کسی طرح اس تحریک سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ شاہ نصیر، مومن، غالب اپنے اپنے طور پر اس تحریک کے حق میں یا مخالف رائے رکھتے تھے۔ مقلدین میں مولوی فضل حق تھے اور غیر مقلدین میں شاہ اسمٰعیل، سرسید احمد خان اور مومن خود سید احمد بریلوی کے مرید تھے۔ غالب نے بھی ان مباحث میں ایک حد تک عملی حصہ لیا۔ چنانچہ اس تحریک سے متعلق جو اہم ترین بات ہے تو وہ یہ کہ غالب کا نقطۂ نظر غیر تقلیدی اور شاہ اسمٰعیل سے ہم آہنگ تھا باوجود اس کے کہ ان کا ربط ضبط اور رسم و راہ مولوی فضل حق سے جو مقلدین کے سرگرم ترجمان تھے، بہت زیادہ تھی۔ صاحب آثار غالب نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جس طرح غالب نے شاہ اسمٰعیل کو مذہب میں تقلید کے خلاف جہاد کرتے دیکھا اس نے ان کی طبعی آزاد خیالی کو اور بھی راسخ کر دیا اور اس ہی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے بھی فن ولغت نویسی اور فن شعر گوئی میں استادوں پر آزادانہ نکتہ چینی کی اور کہا کہ ''اگلے جو کچھ کہہ گئے ہیں وہ سب صحیح نہیں۔ ہر پرانی لکیر صراط مستقیم نہیں ہوتی''۔ آثار غالب۔ ص 51۔

آگرے کے قیام میں معترضین کے طنز وطعن کی غالب نے پروانہ کی اور وہ ان کو ''جاہل'' ہی تصور کرتے رہے۔ لیکن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دہلی کے قیام میں اہل علم وصاحبانِ ذوق سے قریبی تعلق، ہم چشم، باذوق احباب کی روک ٹوک، علم وادب کے معیاری ماحول اور پھر فارسی شعرا کے باقاعدہ مطالعہ نے انہیں اپنے اسلوب پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر دیا۔ یہاں ان کی وہ چھٹی حس جس نے ان کے آباواجداد کو زمانے کے سرد وگرم میں زندگی کی راہ بتائی، یکایک جاگ اٹھی اور چونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے پاس زندہ رہنے کے لئے صرف متاعِ شعروسخن ہی ہے، اور اس ماحول میں اگر اپنی انفرادیت برقرار رکھنی ہے، ہم چشموں کے شانہ بشانہ چلنا ہے اور اپنے مطلوبہ وانتخاب کردہ طبقے ہی میں زندگی گزارنی ہے تو اپنے اسلوبِ نگارش کو تبدیل کرنا ہوگا۔ ورنہ خود بیدلؔ کی طرح فنا ہو جاؤ گے اور کہیں نشانِ باقیات نہ ملے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ آگاہی انہیں رفتہ رفتہ ہی ہوئی ہوگی اور یہ فیصلہ انہوں نے خواب میں کوئی بشارت پا کر نہیں کیا ہوگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دہلی میں انہوں نے اپنے اسلوب کے دفاع میں آگرے میں کہی گئی رباعی کو قدرے تبدیل کر دیا۔ یعنی

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
ہوتے ہیں ملول اس کو سن کر جاہل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اس کے دوسرے مصرع کو تبدیل کر کے ''سن سن کے سخنورانِ کامل'' کر دیا۔ اس تبدیلی سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ اب انہیں اپنے معترضین کی بات میں حقیقت اور سچائی بھی نظر آنے لگی اور ان کی نقد علم پر ان کا اعتماد بھی بحال ہو گیا۔ اور پھر وہ فارسی کلاسیکی شعرا کی پیروی کو بھی راست روی تصور کرنے لگے۔

ہرزہ مشتاب وپئے جادہ شناساں بردار
اے کہ درراہِ سخن چوں تو ہزار آمدورفت

''گلِ رعنا'' میں شامل دیوان ریختہ کے متعلق آزاد (صاحب آبِ حیات) کا بیان ہے کہ یہ انتخاب مولانا فضل حق اور مرزا خانی کوتوال دہلی نے کیا۔ جب کہ مرزا کے اپنے بیانات اور معاصرانہ تذکروں سے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ انتخاب خود غالبؔ ہی نے کیا۔ یہ خیال بھی درست ہی ہوگا لیکن مرزا کی شاعری میں جو عظیم الشان تبدیلی ہوئی اس سے کسی خارجی رہنمائی یا دخل کو ہرگز خارج از مکان نہیں قرار دیا جا سکتا اور بقول غالبؔ انہوں نے اپنا طرز خاص اس لئے ترک کیا کہ اسے ''یاروں نے چلنے نہ دیا'' (جلوۂ خضر)۔ دراصل حقیقت وہی تھی جو اوپر بیان ہو چکی ہے۔ تین پشتوں کے تجربے نے انہیں بتا دیا تھا کہ ان حالات میں زندہ رہنے ہی کے نہیں بلکہ سربرآوردہ طور پر زندہ رہنے کا کیا طریقہ ہے۔ سو انہوں نے اپنی متاعِ شعروسخن کو اپنا واحد ہتھیار سمجھتے ہوئے اس سے وہی کام لیا جو احمد بخش خان نے اپنی دوعملی، انگریزوں سے ساز باز اور اپنی دنیاداری، چالاکی اور ہوشیاری سے لیا اور اس طرح نہ صرف یہ کہ اپنے دور میں طبقۂ امراوخواص سے منسلک رہے بلکہ بادشاہ تک سے قربِ خاص کے دعوے دار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو گئے اور دنیائے شعر وادب میں اپنے لئے ایسا پُرشان وشوکت ایوان تعمیر کیا کہ جس کی آب وتاب رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلے پر پون کمار ورما کی رائے بھی دیکھ لیں کہ وہ اس تبدیلی کو کس نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اپنی مشہور تصنیف ''غالب شخصیت اور عہد'' میں تحریر کرتے ہیں'' تاہم آخر الامر ایسا لگتا ہے کہ اس وقت جب کہ وہ دنیائے شاعری میں نئے نئے متعارف ہو رہے تھے، انہوں نے رائے عامہ کو خاطر میں نہ لانے کے اپنے رجحان کو حد سے زیادہ اہمیت دے کر اپنی ادبی پذیرائی کو خطرے میں ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ جانتے تھے کہ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ ایک مصالحت بھی تھی اور نکتہ چینوں کے طنز وتعریض کی ایک حد تک معقولیت کا بادل ناخواستہ اقرار بھی۔'' (ص ۱۱۹) گویا انہیں زندہ و تابندہ رہنے کے لئے اور اپنی متاع کو فنا ہونے سے بچانے کے لئے یہ مصالحت لازمی تھی۔ سو وہ مصالحت انہوں نے بڑے شدّ ومد سے کی اور جریدۂ عالم پر اپنے لئے نقشِ دوام چھوڑ گئے۔ ہم اس کو چاہے ان کی ترقی پسندی سے تعبیر کریں یا بیدار مغزی سے، فراست سے یا ذکاوت سے، حقیقت میں یہ ان کی وہی چھٹی حس تھی جو ان کو ان کے بزرگوں سے ورثہ میں ملی تھی اور جو عمومی طور پر تحفظِ ذات کے لئے فطرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے۔

انشائے غالب کے عنوان کے تحت صاحبِ آثار غالب نے غالب کی اس بیدار مغزی اور ترقی پسندی کا ایک اور بھی ثبوت یہ پیش کیا ہے کہ انہوں نے تقریباً ۲۸ سال کی عمر میں اپنے عزیز دوست اور برادر نسبتی علی بخش خان کے لئے ان کی استدعا پر فارسی مکتوب نگاری پر جو مختصر رسالہ صرف تین دن میں تحریر کر کے مکتوب نگاری کا ایک انتہائی ترقی پسند دستور العمل پیش کیا اس سے بھی ان کی ذہنی پختگی اور بیدار مغزی کا ثبوت ملتا ہے۔'' اور اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ خط وکتابت کا جو نفیس اسلوب مرزا نے تیس برس بعد اردو زبان میں اختیار کیا اور جس سے ان کے اکثر فارسی خطوط عاری ہیں اس وقت بھی انہیں پسند خاطر تھا''۔ یہاں ایک انتہائی معقول سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب غالب نے اٹھائیس سال کی عمر میں خطوط نگاری کا ایک ترقی یافتہ دستور العمل خود مرتب کر دیا تھا تو انہوں نے اس پر تیس سال تک عمل کیوں نہیں کیا۔ بلکہ کہنا یہ چاہیے کہ بھرت پور کے محاصرے میں وہ جنرل کامبرمیر کے لشکر کے ساتھ اپنے سالے علی بخش خان اور چچا سسر احمد بخش خان کی معیت میں یہ دستور العمل مرتب کر رہے تھے اور ابھی اس دستور العمل کی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ انہوں نے سفر کلکتہ کے دوران اپنے خطوط میں اس دستور العمل کی کھلی خلاف ورزی شروع کر دی اور یہ خلاف ورزی بہمہ شدّ ومد آئندہ تیس سال جاری رہی تاوقتیکہ انہوں نے خود اردو میں مکتوب نگاری کا ایک نیا اسلوب جو سلاست بیان اور راست مدعا نگاری میں ان کے دستور العمل سے ہم آہنگ تھا، اختیار نہیں کر لیا۔ اس سوال کا جواب چونکہ قدرے طویل اور زیر نظر مقالے کے محیط سے باہر ہے اس لئے فی الوقت اس سے صرف نظر کر کے ہم اپنی توجہ غالب کی طبعی انفرادیت، ترقی پسندی، بیدار مغزی، حیات پرستی فراست وذکاوت تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ ان کی طبیعت کی یہ خصوصیات ثابت کرتی ہیں کہ وہ ذہنی طور پر اپنے وقت سے بہت آگے تھے۔

اس ترقی پسندی کا پہلا مظہر تو ان کی انفرادیت اور جدّت پسندی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ لڑکپن میں ان کا رجحان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ظہوریؔ اور بیدلؔ جیسے شعرا کی طرف تھا۔ اُردو کی ابتدائی شاعری بھی اس ہی انفرادیت اور جدت پسندی کا شاخسانہ تھی۔ پھر یہ جدّت پسندی اور انفرادیت بھی اس انتہا کی تھی کہ فکری میدانوں کو پار کر کے خارجی دنیا پر بھی حاوی تھی۔ ان کی بول چال میں نشست و برخاست میں، لباس میں، کھانے پینے میں غرض یہ کہ ان کے اکثر خارجی رویے بھی عمومی رویوں سے بالکل مختلف اور منفرد تھے۔ وہ اس وقت پاپاخ اوڑھا کرتے تھے جب کوئی دوسرا نہیں اوڑھتا تھا۔ وہ لُنگی جو وہ سر پر باندھتے تھے وہ بھی عام دلّی والوں کی طرز سے مختلف ہوتی۔ انہوں نے اپنے چہرے کی ہیئت میں بھی دوسروں سے ہمیشہ امتیاز رکھا۔ یعنی جب داڑھی رکھی تو سرمنڈوا دیا۔ انہوں نے سرسید کو اس وقت آئینِ اکبری کی تصحیح پر تقریظ لکھنے سے انکار کر دیا جب ان کے ذاتی تعلقات نہ صرف سرسید سے بلکہ ان کے خاندان سے نہایت گہرے تھے اور ان کے اس کام کو یک لخت مسترد کر دیا۔ اور مسترد صرف اس اصول پر کیا کہ انگریزوں کے بنائے ہوئے آئین و قوانین و ایجادات کے سامنے پچھلے سارے آئین تقویم پارینہ ہو چکے ہیں اور اس انکار پر لوگوں سے آفریں طلب بھی ہوئے۔

گر بدیں کارش بگویم آفریں
جائے آں دارد کہ جویم آفریں

غالبؔ کی جدّت پسندی کو مزید مہمیز ان کے سفر و قیامِ کلکتہ سے بھی ملا۔ وہاں انہوں نے ایک منظّم معاشرہ دیکھا، ڈاک و تار کا نظام دیکھا دخانی جہاز دیکھے اور انگریزوں کے قائم کردہ تعلیمی اداروں کو پورے زور شور سے کام کرتے دیکھا۔ سر ڈنکن نے ۱۷۹۱ء بنارس میں ہندو سنسکرت کالج کی بنیاد رکھی تھی۔ ۱۸۰۰ء میں لارڈ ویلزلی نے فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی۔ آگرہ کالج ۱۸۲۳ء میں قائم کیا گیا اور بعد میں بمبئی، بنگال اور مدارس تینوں پریزیڈینسیوں میں یونیورسٹی کی ابتدا ہوئی۔ ۱۸۲۴ء سے ۱۸۵۷ء تک دہلی کالج دانشِ جدید کا مرکز بن گیا۔ سی ایف اینڈریوز کہتے ہیں ’’ کالج میں اردو عربی اور فارسی ادب کے لئے ایک علیحدہ اور ینٹیل یعنی مشرقی شعبہ بھی تھا جس کو ۱۸۴۸ء تک اپنے نصاب کی جامعیت کے لحاظ سے انگریزی شعبے سے برابری کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ یہ شعبہ نہایت مقبول تھا اور جدید انگریزی علوم کی تحصیل کے لئے طلبا ان جماعتوں کو جہاں ذریعہ تعلیم اردو تھا چھوڑتے نہیں تھے۔ فارسی اور عربی میں طلبا کی جس معیار تک رسائی ہوتی تھی وہ بہت اونچا تھا۔ ممتاز مشاہیر ادب مثلاً نامور شاعر الطاف حسین حالیؔ، اردو کے مسلم الثبوت نثر نگار نذیر احمد، عربی کے ممتاز فاضل مولوی ضیاء الدین مورخ اور بے شمار تصانیف کے مترجم مولوی ذکاءاللہ اور ادبی تنقید کی کتاب آبِ حیات کے مصنف محمد حسین آزادؔ کا تعلق اسی مشرقی شعبے سے تھا‘‘۔ تعلیم جدید کی اس یلغار نے غالبؔ پر واضح کر دیا کہ اولاً فارسی کا دور ختم ہو چکا ہے۔ دوئم اسلوبِ نگارش میں اب سلاست کا دور آنا وقت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اور قائم و دائم اور زندہ و پائندہ رہنے کے ابدی قانون کے مطابق انہوں نے اپنے مرتبہ دیوان سے دو ثلث نکال کر وقت کی ہدایت کو قبول کر لیا۔ چنانچہ کلکتے کے قیام کے دوران ان کے ایک عزیز دوست سراج الدین احمد کے ایما پر جن کا اخبار آئینہ سکندری سے بھی تعلق تھا اور جن کے نام غالبؔ کے بہت سے فارسی مکتوبات ہیں یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انتخاب کلامِ اردو و فارسی عمل میں آیا اور اس انتخاب کا نام "گلِ رعنا" رکھا گیا۔ چونکہ اردو دیوان ان کے سفر کلکتہ سے پہلے ہی مرتب ہو چکا تھا، اس لئے اردو انتخاب ردیف وار بھی ہے اور جن غزلوں پر مشتمل ہے ان کی تعداد بھی زیادہ یعنی ۱۱۷ ہے۔ اس کے مقابلے میں فارسی کلام کا دائرہ بہت محدود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سفر کے زمانے تک انہیں فارسی میں شعر گوئی کی طرف توجہ زیادہ ہوئی ہی نہیں تھی۔" (ذکرِ غالب۔ مالک رام ص ۱۶)

آیئے اب غالب کے دوسرے فیصلے کو دیکھتے ہیں۔ یعنی آغا میر سے ملاقات کو۔ "مرزا جب لکھنو پہنچے تو وہاں غازی الدین حیدر بادشاہ تھے۔ اپنے والد نواب سعادت علی خان کی وفات کے پانچ سال بعد تک وہ نواب وزیر ہی کہلاتے رہے لیکن ۱۸۱۸ء میں لارڈ ہیسٹنگز (Hastings) نے شاہ دہلی کی کسی بات سے بگڑ کر نظام حیدر آباد اور نواب وزیر اودھ کو بادشاہ کا خطاب اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ حضور نظام نے مغلیہ بادشاہ کے احترام کے خیال سے نہ مانا لیکن غازی الدین حیدر نے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اور ۱۸۱۹ء میں بڑی دھوم دھام سے ان کی تخت نشینی ہوئی جس کی تاریخ نے تاریخ کہی۔ بگو تاریخ کہ ظل اللہ گردید۔۔۔۔ جب غالب لکھنو پہنچے تو بادشاہ کی خدمت میں باریابی کے لئے انہیں نائب السلطنت معتمد الدولہ آغا میر کی مدد کی ضرورت تھی جنہوں نے آغاز ملازمت خانساماں کی حیثیت سے کیا تھا لیکن نواب بیگم اور ریزیڈنٹ کی مدد سے بادشاہ پر اس قدر اقتدار حاصل کر لیا تھا کہ اب وہ سلطنت کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ جیسا کہ غالب کے خطوں سے پتہ چلتا ہے ان کی نیابت تاریخ اودھ کا ایک نہایت تاریک باب ہے۔ مرزا نے ان کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے ایک نثر صنعت تعطیل میں لکھی۔ لیکن اس نثر کے پیش کرنے کی نوبت نہ آئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ملاقات کے لئے غالب نے جو شرطیں پیش کیں انہیں مرزا باعث شرم و خودداری سمجھتے تھے۔ چنانچہ خود اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔ آنچہ در بابِ ملازمت قرار یافت خلاف آئین خویشتن داری و ننگ شیوہ خاکساری بود"۔ مرزا بقول خود اس وقت نو آموزِ شیوۂ گدائی تھے اور شاہانِ اودھ کی تعریف میں پہلا قصیدہ جو انہوں نے لکھا ہے اس میں بار بار اس امر کی طرف اشارہ ہے۔

ناز پروردۂ خلوت گہِ آزاد گیم
کافرم گر بسرا پردۂ سلطاں رفتم
من ہم از خیل کریما نم و خجلت نبود
گر بہ دریوزہ بدرگاہِ کریماں رفتم

(آثارِ غالب شیخ محمد اکرام۔ ص ۱۷)

لیکن اس ضمن میں مالک رام حالی کا حوالہ دیتے ہوئے ذکرِ غالب میں یہ تحریر کرتے ہیں "مرزا آغا میر کی خدمت میں جانے کو تو راضی ہو گئے لیکن بقول حالی انہوں نے اس کے ساتھ ہی یہ شرط لگا دی کہ اول میرے پہنچنے پر آغا میر میری تعظیم دیں یعنی اپنی جگہ کھڑے ہو کر پذیرائی کریں۔ دوم یہ کہ مجھے نقد نذر دینے سے معاف رکھا جائے۔ بلکہ غالب یہ چاہتے تھے کہ آغا میر ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے معانقہ بھی کریں۔''گدا طبع سلطان صورت'' آغا میر اعزاز و اکرام کی اس حد تک جانے پر راضی نہ ہوا۔ادھر مرزا اس سے کم کو آئینِ خویشتن داری کے خلاف اور شیوہ خاکساری کے لئے ننگ خیال کرتے تھے اس لئے ملاقات نہ ہوسکی۔'' (ص ۶۱)

پون کمار ورما اپنی مشہور تصنیف ''غالب عہد اور شخصیت'' میں اس ملاقات کی بابت لکھتے ہیں ''مربیوں کو ملتجی کی طرف سے شرطوں کا عائد کیا جانا اچھا نہیں لگتا۔ایسا لگتا ہے کہ نواب سے ملاقات کی کوئی شکل نہ نکلنے کے بعد غالب کو اس مہم سے کوئی خاص دل چسپی نہیں رہی تھی۔ یہ واقعہ غالبؔ کی زندگی میں سرپرستانہ امداد کے سرچشموں کی تعظیم وتکریم پر آمادہ کرنے والی ان کی مالی حالت اور ایک شاعر اور طبقۂ امرا کے رکن کی حیثیت سے اپنی قدر و قیمت پر ان کے اس یقین کلی کے درمیان کش مکش کی بہت اچھی مثال پیش کرتا ہے۔جس کی رو سے غلامانہ ذہنیت کا کوئی بھی اظہار ان کے لئے باعث ذلت تھا۔ یہ کش مکش اکثر انہیں اظہار احترام میں جھکنے کے تمام مراحل سے گزارتی لیکن لحہ آخر میں وہ پھر سیدھے کھڑے ہو جاتے۔میرے خیال سے اس ملاقات کی ناکامی پر اس سے بہتر شرح نہیں ہوسکتی۔

اب آیئے غالبؔ کے آخری فیصلے پر نظر ڈالتے ہیں۔اس واقعے کے بارے میں صاحب یادگار غالبؔ تحریر کرتے ہیں۔

''تذکرہ آب حیات میں لکھا ہے کہ جب ۱۸۴۲ء میں دہلی کالج نئے اصول پر قائم کیا گیا مسٹر ٹامسن سیکرٹری گورنمنٹ ہند مدرسین کے امتحان کے لئے دلی آئے اور چاہا کہ جس طرح سو روپیہ ماہوار کا ایک عربی مدرس کالج میں مقرر ہے اسی طرح ایک فارسی کا مدرس مقرر کیا جائے۔لوگوں نے مرزا غالبؔ،مومن خان اور مولوی امام بخش،کا ذکر کیا۔سب سے پہلے مرزا کو بلایا گیا۔مرزا پالکی میں سوار ہو کر صاحب سیکرٹری کے ڈیرے پر پہنچے۔صاحب کو اطلاع ہوئی۔انہوں نے فوراً بلا لیا۔مگر یہ پالکی سے اتر کر اس انتظار میں ٹھہرے رہے کہ دستور کے مطابق صاحب سیکرٹری ان کو لینے آئیں گے۔جب بہت دیر ہوگئی اور صاحب کو معلوم ہوگیا کہ اس سبب سے نہیں آئے تو وہ خود باہر چلے آئے اور مرزا سے کہا کہ جب آپ دربارِ گورنری میں آئیں گے تو آپ کا اسی طرح استقبال کیا جائے گا لیکن اس وقت آپ نوکری کیلئے آئے ہیں اس موقع پر وہ برتاؤ نہیں ہوسکتا۔مرزا صاحب نے کہا گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اس لئے کیا ہے کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو نہ اس لئے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آئے۔صاحب نے کہا ہم قاعدے سے مجبور ہیں۔مرزا نے کہا مجھ کو اس خدمت سے معاف رکھا جائے۔اور یہ کہہ کر چلے آئے''۔(ص۔۲۹ یادگار غالبؔ)

صاحب آثار غالب نے بھی یہ واقعہ من وعن اسی طرح نقل کیا ہے بجز اس کے کہ انہوں نے یہ نہیں لکھا کہ غالب ٹامسن سے ملنے کہاں پہنچے۔یعنی وہ جگہ جہاں وہ ملنے گئے وہ ان کا دفتر تھا یا بقول حالی ''سیکرٹری صاحب کا ڈیرہ''۔البتہ مالک رام نے ذکر غالبؔ میں اس واقعہ کا سنہ ۱۸۴۰ء لکھا ہے اور حاشیہ میں اس حقیقت کی صراحت بھی کی ہے۔کہ حالیؔ نے آزاد کا لکھا ہوا سال نقل کر دیا ہے جو غلط ہے۔صحیح ۱۸۴۰ء ہی ہے جو مرحوم دہلی کالج میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے لکھا ہے۔اس بات کے علاوہ دوسری اہم بات یہ کہ انہوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ یہ ''یعنی مرزا غالبؔ اگلے دن ان کے بنگلے پر پہنچے'' گویا وہ جگہ جہاں غالبؔ ان سے ملنے پہنچے وہ سیکرٹری ٹامسن کی اقامت گاہ تھی کالج کا دفتر نہ تھا۔یہ تفصیل اس لئے ضروری ہے کہ دونوں جگہ پر استقبال کے مختلف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آداب ہیں۔ باقی تفصیلات دوسرے سوانح نگاروں کے ہاں بھی وہی ہیں جو حالی نے یادگار غالب میں بیان کیں۔

ٹامسن کے رویے پر میرا ذاتی ردّ عمل تو یہ ہے کہ اس کا رویہ دنیا کی مسلمہ اور مہذب اقدار نشست و برخاست کے بالکل خلاف تھا اور وہ اس لئے کہ غالبؔ ان سے ملاقات کے لئے ان کی جائے اقامت پر گئے تھے۔ اگر وہ جگہ سرکاری دفتر ہوتی تب تو شاید ٹامسن کے رویے کا کوئی جواز نکلتا تھا جب کہ اس صورت میں ہرگز نہیں نکلتا۔ مزید برآں میں یہ کہنا بھی پسند کروں گا کہ یہ ''صاحب لوگ'' جو ایک نئے معاشرے کی بنیادیں استوار کر رہے تھے ایک زوال آشنا جاگیردارانہ معاشرے کی پرانی اقدار سے بھی آشنا تھے اور ان کو لندن سے ہندوستان آنے سے پیشتر زبان و ادب ہی نہیں سالوں یہاں کے ادب و آداب بھی سکھائے جاتے تھے۔ جب وہ یہاں کی سماجی اقدار سے کلیتاً واقف تھے تو ان کو غالبؔ کے علمی و ادبی مرتبے کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے وہ ساری رعایات دینی چاہیے تھیں جس کے وہ حق دار تھے۔ اب غالبؔ کی طرف سے دیکھا جائے تو ان کا فیصلہ سو فیصد درست تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اپنے معاشرے میں ایک نامور شاعر کی حیثیت سے تو وہ کسی مربّی کی سرپرستی یا طبقۂ امرا میں سے کسی کی کفالت تو قبول کر سکتے تھے لیکن کسی کالج میں ملازم ہو کر مدرسی کا تصور ہی چونکہ نا آشنا اور اجنبی تھا اس لئے اس کو تو وہ برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے۔

یہاں انتہائی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ آثار غالبؔ کے ان الفاظ پر جو انہوں نے اس واقعہ کے نفسیاتی تجزیے کے طور پر لکھے ہیں اس مقالے کو ختم کیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں بعض لوگ حیران ہیں کہ مرزا جو عام مجسٹریٹوں اور معمولی متصدّیوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے تھے اور خوشامد و تملّق کا کوئی پہلو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے، وہ حکومتِ ہند کے ایک اعلیٰ عہدیدار کے استقبال نہ کرنے سے کیوں اس قدر چراغ پا ہو گئے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مرزا مدحیہ قصائد میں جو ایک طرح کا مبالغہ روا رکھتے اس کو وہ ایک شاعرانہ رسم سمجھتے تھے جسے شروع سے سب شاعر نباہتے آئے ہیں اور انگریز افسروں کی تعریف میں ان کے قصائد منظوم عرضیاں ہیں جنہیں زیادہ موثر بنانے کے لئے مرزا نے بجائے نثر کے نظم میں لکھا ہے۔ وہ طبعاً خوددار و حساس تھے۔ اور خاندانی اعزازات کی ایک ایک بات پر جان دیتے تھے اور اس لئے ہر وہ عمل جو ان کے معاشرتی منصب کی تنقیص کرتا ان کے لئے قابل برداشت نہ تھا۔''

☆☆☆

© rasailojaraid.com